ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

ڈاکٹر غلام اصغر ❁

فکر تونسوی کی طنز و مزاح نگاری میں سماجی و سیاسی مسائل کی پیش کش

Presention of Social and Political problems in Satire and Humor of Fikr Taunsavi

By *Dr. Ghulam Asghar, Lecturer, Dept. of Iqbal Studies, The Islamia University of Bahawalpur.*

Abstracts

Fikr Taunsvi started his writing career by platform of progressive movement of Urdu literature. The Progressives were politically oriented writers who intended social change. Their target was English rule, feudal system and social corruption in India and satire was their chief method. For these satirists socio-political situation of India has much matter to write on. Fiker wrote extensively and his satire is bitter and corrosive. Even some titles of his writings such as *Satwan Shastr* (Seventh Code), *Chaupat Raja* (The Blind Prince) and *Chand aur Gadha* (The Moon and Dunkey) express his aversion and hatred for politics of that time. But his writing career ended with humor that no other progressive writer of time did. Usually mode of writers changes with changes in personal life. The bitter mode and passion of Fikr abated with easiness in his life. The bloodshed of Partition was a thing of past and India has her future in her own hand that helped to change the outlook of society and apprehensions of writers. In this research paper *Presentation of Social and political*

❁ لیکچرر، شعبۂ اردو و اقبالیات، دی اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور، رحیم یار خان کیمپس

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

problems in Satire and Humor of Fikr Taunsavi the researcher has analyzed the satire of Fikr and the conditions that led him to write humor.

Keywords: Progressive, satire, humor, Partition, social corruption, feudal system, English rule.

رام لعل بھاٹیہ (فکر تونسوی) کا شمار برصغیر پاک وہند کے ممتاز طنز ومزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ ۷/ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازیخان کے مضافاتی قصبے منگڑوٹھہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے میٹرک تک تعلیم تونسہ شریف میں حاصل کی۔ انٹرنس کے لیے ایمرسن کالج ملتان میں داخلہ لیا مگر معاشی تنگ دستی کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ تلاش معاش میں مختلف جگہوں کی خاک چھانتے ہوئے لاہور پہنچے جہاں وہ اردو کے مشہور ادبی جریدہ ”ادب لطیف“ کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ یہ فکر تونسوی کی زندگی کا نیا جنم تھا۔ یہاں فکر صاحب کو اپنی ادبی صلاحیتوں کو نکھارنے اور ادبی پہچان بنانے کے مواقع میسر آئے. لاہور میں ہی انھیں ممتاز مفتی، قتیل شفائی، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، عارف عبدالمتین، احمد راہی جیسے ادبی دوستوں کی رفاقت میسر آئی۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کی وجہ سے ان کو لاہور چھوڑنا پڑا جو ان کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا. وہ ان فسادات کے دوران ریفیوجی کیمپس کے دلدوز مناظر جھیلتے ہوئے ہندوستان پہنچے۔ جہاں انھیں بہت مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے دہلی میں ”روزنامہ ملاپ“ میں ”پیاز کے چھلکے“ کے عنوان سے طنزیہ ومزاحیہ کالم لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے کالم ”پیاز کے چھلکے“ کو غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ فکر تونسوی نے مختلف موضوعات پر درجنوں تصانیف شائع کیں۔ متفرق تصانیف میں ”ہیولے“ (شعری مجموعہ)، ”چھٹا دریا“ (رپورتاژ)، ”خدوخال“ (خاکے)، ”ماؤسی تنگ“ (سوانح)، ”پروفیسر بدھو“ (ناول)، ”چوپٹ راجا“ (ناول)، ”پنجاب کو سلام“ (ناول)، ”میں“ (خودنوشت)، ”میری بیوی“ (خودنوشت) شامل ہیں جبکہ طنز ومزاح پر مشتمل کتابوں میں ”ساتواں شاستر“، ”تیر نیم کش“، ”چاند اور گدھا“، ”وارنٹ گرفتاری“، ”پیاز کے چھلکے“، ”فکریات“، ”چھلکے ہی چھلکے“، ”آدھا آدمی“، ”کفن سے کُرتے تک“، ”بات میں گھات“، ”فکر بانی“، ”فکر نامہ“، ”ماڈرن الہ دین“، ”بدنام کتاب“، ”گھر میں چور“ نمایاں ہیں۔ وہ پاک وہند کے مشہور اخبارات ورسائل ”ادبِ لطف“، ”سویرا“، ”ادبی دنیا“، ”نقوش“، ”افکار“، ”معیار“، ”شگوفہ“، ”شاہراہ“، ”بیسویں صدی“، ”چنگاری“، روزنامہ ”امروز“، ”رفتار

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

"، "نیا زمانہ"، "آج کی خبر" اور "ملاپ" میں عمر بھر لکھتے رہے۔ انھیں ہندوستان کے اہم ادبی اعزازات سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، یوپی اردو اکامی ایوارڈ اور غالب ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انھوں نے ۱۲/ ستمبر ۱۹۸۷ کو گل مہر پارک دہلی میں وفات پائی۔ فکر صاحب کی دو بیٹیاں رانی آہوجہ اور شمن لتا، ایک بیٹا پھول کمار بھاٹیہ، ہیں جو دلی میں مقیم ہیں۔ ان کی نواسی ڈاکٹر آستھا آہوجہ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی دلی میں اکنامکس کی اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

فکر تونسوی میں ادبی رجحان پیدا کرنے میں ان کے اساتذہ نے اہم کردار ادا کیا۔ اسے ایسے علم دوست استاد میسر آئے جنھوں نے فکر کے اندر ادبی ذوق بھر دیا۔ ان کے اساتذہ میں مولوی صالح محمد ادیب تونسوی بھی تھے جو اُردو اور فارسی کے شاعر، بہترین نثر نگار اور علامہ اقبال کے دوست تھے۔ ان کی اصل شہرت علامہ اقبال کے وہ سترہ خطوط ہیں جو علامہ اقبال نے انھیں ۱۰ مئی ۱۹۳۰ء تا فروری ۱۹۳۲ء کے درمیان لکھے۔ راقم الحروف نے علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے مولوی صالح محمد: فن و شخصیت پر ایم فل کا تحقیقی مقالہ ۲۰۱۳ء میں ڈاکٹر قاضی عبدالرحمٰن عابد کی نگرانی میں مکمل کیا۔ فکر تونسوی نے اپنے استاد کی قابلیت، خلوص اور صداقت کو ان الفاظ میں بیان کیا:

> ہاں میں نے مولوی صالح محمد کی چھتر چھایا میں اُردو، عربی، فارسی کے وہ اسباق پڑھے جن میں ایک اجلا خلوص، صداقت اور گہرائی ہے اور عشق شامل ہوتا تھا۔ میری تربیت کی جڑوں میں مولوی صالح محمد نے جو ادبی، سماجی اور مذہبی بیج ڈالے ان میں سے صرف انسان سے عشق کا تناور درخت ابھرا۔ (۱)

تونسہ شریف علمی لحاظ سے تو زرخیز تھا مگر سماجی طور پر غربت، جہالت، بھوک اور افلاس کا مرکز تھا۔ نہ صنعت و حرفت کا کوئی نام و نشان نہ تجارتی سرگرمیوں کے کوئی آثار نہ زراعت کی کوئی بہتر صورت حال۔ دور دور تک پھیلے ہوئے چٹیل میدان، ریت کے ٹیلے اور خشک جھاڑیاں تھیں۔ رود کوہیوں یا برساتی نالے آبپاشی کا واحد ذریعہ تھے۔ جب رود کوہیوں کا پانی یہاں کے کھیتوں کو سیراب کرتا تو افلاس کے مارے چہرے خوشی سے کھل اُٹھتے۔ مگر جب ان گستاخ ندیوں میں طغیانی آجاتی تو اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے جاتی، اگر بارشیں نہ ہوتی تو یہاں کے لوگ حسرت کی تصویر بن جاتے۔ چنانچہ کئی کئی سال تک ان لوگوں کو قحط اور خشک سالی کا سامنا کرنا پڑتا۔ یہ علاقہ دریاے سندھ سے زیادہ دور تو نہیں تھا مگر دریاے سندھ کا پانی ان زمینوں کو آباد نہیں کرتا تھا۔ یہاں کا زیرِ زمین پانی گہرا تھا اور شیریں بھی نہ تھا۔ پانی جتنا کڑوا تھا لوگوں کے مزاج میں اس سے کہیں زیادہ شیرنی

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

اور مٹھاس تھی۔ ہندو اور مسلمان مل جل کر رہتے۔ ان کے دکھ سکھ سانجھے تھے۔ سب ایک کنوئیں سے پانی بھرتے، کوئی ہندو اور مسلمان پانی نہ تھا۔ فکر تونسوی لکھتے ہیں:

> پورے گاؤں میں صرف چار کنوئیں تھے۔ جن کا پانی رسیلا اور شیریں ہوا کرتا تھا۔ ہندو اور مسلمان سبھی گھرانے انھیں کنوؤں سے مٹکے بھر کر گھر لے جاتے تھے۔ وہاں پانی کو ہندو پانی اور مسلمان پانی نہیں کہا جاتا تھا۔ یہ تو جب بڑا ہو کر میں بڑے شہروں میں آیا تو انکشاف ہوا پانی کا بھی مذہب ہوتا ہے۔(۲)

ان حالات میں فکر تونسوی اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور جلد ہی معاشی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ فکر تونسوی جرنلسٹ بننا چاہتے تھے۔ صحافت اپنانے کے لیے انھوں نے کتابت اور خطاطی سیکھی۔ ہاشم شیر خان اپنی کتاب "ڈیرہ غازیخان کے تہذیبی خدوخال" میں لکھتے ہیں:

> قیام پاکستان سے پہلے محمد صدیق کھرل، فکر تونسوی اور غلام حسین زائر خطاط اور کاتب تھے۔ ڈیرہ غازیخان کے پہلے اخبار "سفینہ" میں یہ تینوں کتابت کرتے رہے۔ ہندو کاتب اور خطاط فکر تونسوی جنھوں نے بعد میں ادیب اور دانشور برصغیر بھر میں شہرت پائی۔ وہ خطاط محمد صدیق کھرل کے شاگرد تھے۔(۳)

ڈیرہ غازی خان کے ہفتہ وار اخبار "اصلاح" ۱۹۴۰ء کے کئی شماروں میں فکر تونسوی کے مضمون اور کلام ملتا ہے۔ اصلاح کے یہ شمارے مشہور اقبال شناس اور محقق ہاشم شیر خان کی لائبریری میں موجود ہیں۔ اس اخبار کے ایڈیٹر سردار اللہ نواز خان کھتران سے فکر تونسوی شاعری میں اصلاح لیتے تھے۔ سردار اللہ نواز خان کھتران اُردو اور فارسی کے عمدہ شاعر تھے۔ کھتران قبیلے کے چیف تھے، ان کا مسکن تونسہ شریف سے پچاس کلومیٹر دور وہوا میں تھا۔ وہ اپنے عہد کی مشہور علمی شخصیت تھے۔ ان کے دو غیر مطبوعہ شعری مجموعے "نقش آہنگ" اور "خیابان نواز" ان کے صاحب زادے کے پاس موجود ہے۔ فکر تونسوی ایک خط (غیر مطبوعہ) میں سردار اللہ نواز خان کو اپنی ایک غزل اصلاح کے لیے بھیجتے ہیں اور خود کو زانوے تلمذ میں لانے کی استدعا بھی کرتے ہیں:

> میرے نادیدہ ہادی بے بدل! طول نگاری سے اپنی وحشت خیزی کی طلب ارمان عبث، خورشید تاباں کو ٹمٹماتی ہوئی شمع دکھانا، اپنی حماقت اور تنگ نگاہی کا ثبوت مہیا کرتا ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ایک بے بضاعت قطرہ، بحر معانی کے وصال کا متمنی ہے۔ اسے ڈھانپ دیجیے۔

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

> تیرہ بخت اور کم فہم فکر ایک جید عالم کے سامنے زانوے تلمذتہ کرنے کی گستاخانہ جسارت کر رہاہے اور غضب تو یہ ہے کہ کم بخت در خورِ اعتنا ہونے کی توقع کا شکار ہو رہا ہے۔ کیا شرف قبولیت کا تکلف بارِ خاطر تو نہیں ہو گا۔ (۴)

یہ خط اس لیے اہم ہے کہ اس سے اس بات کا تعین ہوتا ہے کہ برصغیر پاک وہند کے عظیم طنز و مزاح نگار شاعری میں کس سے اصلاح لیتے تھے۔

فکر تونسوی ڈیرہ غازی خان، جام پور، فیصل آباد، شیخوپورہ کی خاک چھانتا ہوا اور غربت اور اقتصادی بدحالی کے خلاف لڑتا ہوا لاہور پہنچا۔ لاہور پہنچتے ہی فکر کو جیسے خوابوں کی دنیا مل گئی۔ وہ لاہور میں ترقی پسند تحریک کے ترجمان ادبی رسالے "ادبِ لطیف" سے وابستہ ہو گئے۔ فکر تونسوی پہلے کلرک کی حیثیت سے اس رسالے میں کام کرتے رہے مگر جب فکر نے اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا تو فکر کو اس کا ایڈیٹر بھی مقرر کیا گیا۔ ممتاز مفتی بھی ان دنوں ادب لطیف سے وابستہ تھے۔ ممتاز مفتی اور فکر تونسوی نے اکٹھے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ دونوں کو ادبی شہرت "ادبِ لطیف" کی وجہ سے نصیب ہوئی اور دونوں چودھری برکت کی کشتی پر سوار ہو کر منزل مراد تک پہنچے۔

ممتاز مفتی اپنی کتاب "ہند یاترا" میں لکھتے ہیں:

> دونوں ہی غربت کے مارے ہوئے، دونوں کو پیٹ بھرنے کے لیے سب کچھ گوارا۔ دونوں کی گردنیں لٹکی لٹکی، شانے جھکے جھکے، بشرے سہمے ہوئے۔ فکر کے پاس ایک ادھوری مسکراہٹ تھی۔ کاٹ بھر مسکراہٹ جو دوسروں کی نسبت خود کو زیادہ کاٹتی تھی۔ اب بھی ہے میرے پاس وہ بھی نہیں ہے۔ دونوں غصے سے جلے ہوئے، میرا بھڑک اٹھنے والا، اس کا دم پخت۔ دونوں "ادبِ لطیف" کے مدیر تھے۔ وہ کام ہی کام، میں نام ہی نام، تقسیم سے پہلے ادبی ماہنامہ "ادبِ لطیف" مونچھوں پر تاؤ دیے دانش وروں اور ادبی نورتنوں میں شہنشاہ کی طرح براجمان تھا۔ (۵)

اس رسالے سے وابستگی سے فکر کو معاشی تنگدستی سے چھٹکارہ مل گیا۔ یہاں فکر کو مشہور ترقی پسندوں سے ملنے کا موقع ملا۔ فکر کو سوشلسٹ نظریات سے آگاہی کا موقع ملا۔ فکر کی ذات میں پائی جانے والی محرومیاں سوشلسٹ نظریات کو اپنانے کے لیے منتظر تھیں۔ چنانچہ فکر جلد ہی ایک پختہ کار سوشلسٹ اور ترقی پسند بن گئے اور محنت کشوں کی آواز بننے کے لیے شاعری کا سہارا لیا مگر فکر کے اندر جو طلاطم برپا تھا۔ اس کے اظہار کے لیے

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

شاعری کا جامہ ناکافی تھا۔

فکر تونسوی نے ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ اگرچہ یہی خیال کیا جاتا ہے کہ فکر تونسوی نے شاعری ترک کر کے طنز کا تیشہ اٹھایا اور فرہاد بن کر شیریں کے لیے دودھ کی نہر جاری کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے قلم کے تیشے سے معاشرے میں پائی جانے والی کج رویوں، ناہمواریوں، ناانصافیوں، بے چاقیوں کو کرید ڈالا اور طنزیہ مضامین کے انبار لگا دیئے۔ مگر وہ اپنی شیریں (مجبور طبقہ) کے لیے دودھ کی نہریں نہ نکال سکا۔ فکر تونسوی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ہی طنز سے کیا۔ فکر کی شاعری ایک صدائے احتجاج ہے۔ فکر کی شاعری میں رومان، عشق کا شائبہ تک نہیں حالانکہ ہر نوخیز زندگی میں عشق کے گیت لکھتا ہے۔ زلف ور خسار کی باتیں کرتا ہے۔ مگر فکر کو مسائل کے گرداب نے اس قدر گھمایا کہ اسے دنیا کو کسی دوسرے رنگ سے دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس کا واحد شعری مجموعہ "ہیولے" ایک مسلسل طنز ہے۔ جس میں وہ کبھی خدا سے الجھتا ہے کبھی زمینی خداؤں کو طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ کبھی مجبور و مقہور عورت کی بے بسی کو بیان کرتا ہے۔ حوا کی بیٹی، شکنتلا، برہمچاری، بیاہ، اپنی پوجا، سوئمبر میں مرد کے بنائے ہوئے سماج کے عورت پر ڈھائے گئے مظالم پر احتجاج کرتا نظر آتا ہے۔

ہے مرے گرد فصیلوں کا وہ سنگین عذاب
جس کی بنیاد میں بھی وقت کے جباروں نے
گھول دی تھی کسی تقدیس کی موہوم شراب

فکر انسان کی بے بسی، روایت کی زنجیروں میں صدیوں سے جکڑے ہوئے سماج کو مسائل کی چکی میں پستا ہوا دیکھتا ہے تو خدا سے احتجاج اور بغاوت کا اعلان کرتا ہے۔

آہ جب باقی ہے اپنے لیے مقصد نہ مراد
ترے قانون کی کسی ہوئی زنجیروں کو
بے زبان قیدی نہیں ہیں کہ سہے جائیں گے
چھین لے ہم سے یہ بیدار یہ چمکیلی نظر
تیری کونین اُجالی نہیں جاتی ہم سے

فکر کے اسی فکری ارتقا کے دوران عظیم سانحہ رونما ہوا۔ جس کی فکر کے تخیل کا تاج محل تہ و بالا ہو گیا۔ فکر کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ فکر تو جغرافیائی حدود، مذہبی جکڑبندیوں، چھوت چھات، ذات پات کے بندھنوں سے آزاد انسان دوست تھے۔ ہندوستان کا دولخت ہو جانا اس کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ لیکن ہندوستان

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

صرف دولخت نہیں ہوا، ہنستی بستی زندگی اچانک دوراھے پر جا کھڑی ہوئی۔ تقسیم ہندوستان اپنے ساتھ مسائل کا سمندر لے کر آئی جس کے آگے ہر روایت، خلوص و محبت کی بلند فصیلیں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔ فکر کی طنز کا بڑا سرچشمہ ۱۹۴۷ء کے فسادات اور فسادات کے بعد کے مسائل ہیں۔ اگر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا تو فکر تونسوی طنز نگار ہر گز نہ ہوتا۔ فکر کی کتاب "چھٹا دریا"، "ساتواں شاستر" اور سیکڑوں مضامین کا موضوع فسادات اور اس کے بعد کے مسائل ہیں۔ فکر کی نثر کی پہلی کتاب "چھٹا دریا" ہے جو ایک رپورتاژ ہے جس میں ۱۹ اگست ۱۹۴۷ء سے ۸ نومبر ۱۹۴۷ء کے خون آشام چشم دید واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے اعلان کے ساتھ ہی ستلج، چناب، جہلم، راوی اور بیاس کے متوازی خون کا ایک دریا جاری ہوا جسے فکر تونسوی نے "چھٹا دریا" کا نام دیا ہے۔ اس دریا کے بہاؤ میں قرآن، گرنتھ اور گیتا کو ماننے والوں کا مقدس خون، آہ و زاری، چیخ و پکار، آہیں اور سسکیاں کا بڑا اہاتھ تھا۔ فکر ان دنوں لاہور میں تھے۔ ہر طرف آزادی کے نغمے بج رہے ہیں۔ بم پھینکے جا رہے ہیں۔ لاشیں تانگوں میں بھر بھر کر ہسپتال لے جا رہی ہیں۔ سڑکیں ویران ہیں۔ لاہور میں مکمل کرفیو ہے۔ ایک دھوبی کا بچہ بھوک سے بلک رہا ہے۔ دھوبی دودھ کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ دودھ والوں کی دکانیں بند ہیں۔ فکر کے سامنے غالب کا دیوان، آئن سٹائن کا نظریہ اضافت، فیض کی نقش فریادی، مہاتما بدھ کی تصویر، اقبال، جناح، جواہر نہرو کی تصویریں خاموش ہیں۔ فکر ان سے سوال کرتا ہے جو معنی خیز ہے:

> بتاؤ بتاؤ دھوبی کو جواب دو، دھوبی کے مکھن جیسے بچے کو بچانے کے لیے تم کیا کر سکتے ہو، کیا تم دھوکے باز تھے؟ کیا تم ہمیں آج تک فریب دیتے رہے، جب تم کرفیو نہیں کھلوا سکتے، جب تم نرس کو دھوبی کے گھر تک نہیں لا سکتے تو تم نے ہمیں یہ فلسفہ، یہ ادب، یہ تمدن، یہ علم کیوں دیا تھا؟(۶)

ماحول پر سراسیمگی ہے، خبریں مل رہی ہیں، لاشیں گر رہی ہیں۔ امرتسر سے جب لاریاں لاہور آتی ہیں تو اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ لاہور میں ہنگامے شروع ہو جاتے ہیں۔ ہندو اور سکھوں کا قتل عام شروع ہو جاتا ہے۔ لٹے پٹے قافلے سب کچھ لٹا کر آزادی کی بہت بڑی قیمت چکا کر پاکستان و ہندوستان کی سرحد میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہاں ان کا استقبال کیا جا رہا ہے۔ آزادی کا استحصال ہو رہا ہے۔ فکر تونسوی نے اس رپوتاژ میں لوٹ مار کرنے والے غنڈوں کا بھیانک چہرہ عیاں کیا ہے اور انھیں اپنی نفرت اور طنز سے ان کرداروں سے نفرت کرنا سکھائی ہے۔ اس نے چند ایسے کرداروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو ہر تعصب سے پاک ہو کر انسانیت کی حفاظت کے لیے ڈٹے

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

رہے۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ لکھتے ہیں:

> فکر کمیونسٹ تھے اوران کے کمیونزم میں آزادی کے وقت ہونے والی ہجرت، لوٹ مار، درندگی اورانسانیت کی پامالی کابڑا ہاتھ ہے۔ آزادی کوانہوں نے ذہنی طور پر کبھی قبول نہ کیا۔ کیوں کہ جسمانی طور پر تووہ ہجرت کر کے شرنارتھی بن چکے تھے مگر ذہنی طور پر وہ ہمیشہ لاہور میں رہے۔لاہور میں ان کی وابستگی جذباتی تھی۔جب انھیں لاہور چھوڑنا پڑا، لاکھوں انسانوں پر توڑے جانے والے مظالم دیکھنے پڑے، ہجرت کرنے والوں کی حالت زار اور ان کے مسائل دیکھنے پڑے تو ان کے اندر کا حساس انسان چیخ پڑا۔ اس کرب کا اظہار "چھٹا دریا"میں موجود ہے۔(۷)

ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہجرت کرنے والے مہاجروں اور شرنارتھیوں پہ جو گزری اس نے انسانوں کو عجیب خلفشار کا شکار بنا دیا۔لوگوں کو امید تھی کہ اس آگ کے دریا کو عبور کرنے کے بعد جو لوگ زندہ بچیں گے ان کی زندگیاں میں نشاط کے پھول کھلیں گے اور مرجھائے ہوئے چہرے پھر سے ہرے بھرے ہو جائیں گے اور ہجرت کے زخموں کو بھول جائیں گے، مگر وہاں پہنچے تو انھیں ایک اور دریا کا سامنا تھا۔اب نہ لوگوں میں حوصلہ تھا اور نہ مزید دُکھ جھیلنے کی سکت تھی۔ فکر تونسوی بھی ان پناہ گزین کیمپوں کی اذیت ناک اور ذلت آمیز زندگی کامشاہدہ کر چکے تھے۔ چنانچہ ان کی تیسری کتاب "ساتواں شاستر"میں طنز کی تلخی میں بہت شدت ہے۔اس کتاب کی اشاعت آزادی کے دو سال بعد ہوئی۔ اس لیے ان کے اکثر مضامین میں شرنارتھیوں کے مسائل کو بیان کیا گیاہے۔ ان مضامین میں یاسیت کا غلبہ ہے اور ماحول کا گہرا اثر دکھائی دیتاہے۔ڈاکٹر انور سدید فکر کی مزاح نگاری کے متعلق لکھتے ہیں:

> توقع تھی کہ فسادات کا یہ ابال اور جذبات کا یہ الاؤ روبہ اعتدال ہو گا تو ایک متوازی معاشرہ معرضِ وجود میں آئے گا لیکن المیہ یہ ہوا کہ قدروں کی شکستگی نے معاشرے کو ایک نئے زوال سے دوچار کر دیا۔ چنانچہ اب جعلی الاٹمنٹوں، چور بازاری، لوٹ کھسوٹ، رشوت اور سفارش کا بازار گرم ہو گیا جس نے ناآسودگی پیدا کی۔ معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں کو جنم دیا۔(۸)

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

"ساتواں شاستر" کے تمام مضامین میں گہری افسردگی اور مایوسی کی فضا ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر قاری بھی غم کی کیفیت میں دوچار ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کا پہلا مضمون "چوراہا" ہے جس کی ابتدا فکر تونسوی اس طرح کرتے ہیں:

> ہندوستان کے اس بڑے سے شہر کے بڑے سے چوراہے پر بڑی دیر تک بیٹھے رہنا پڑا۔ میرے دیر تک وہاں بیٹھے رہنے کی معقول اور شریفانہ وجہ کوئی نہیں کیونکہ معقولیت اور شرافت تو میں اسی دن سے کھوچکا ہوں جب سے ہندوستان آزاد ہوا ہے۔ آزاد ہندوستان کا آزاد شہری ہونے کی حیثیت سے مجھے آزادی کے ساتھ ہر جگہ پر بیٹھے رہنے کا حق ہے۔ البتہ میرے وہاں بیٹھنے رہنے کی ایک غیر معقول وجہ ضرور موجود ہے اور وہ یہ کہ میرا کام یعنی شاعری اور ادب پاکستان چلا گیا۔[۹]

دوسرے شرنارتھیوں کی طرح فکر کو بھی کچھ عرصہ تک بے روزگاری، مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں کسی دوست کے ہاں اصطبل میں رہنا پڑا اور اُردو شعر و ادب کی سرگرمیاں کا بھی فقدان تھا اور اُردو کے شعرا و ادبا کو شبہ ہوا کہ شاید اب ہندوستان میں اُردو کا کوئی مستقبل نہیں۔ لہٰذا اُردو ادیبوں کو بیکار ہی رہنا پڑے گا۔ فکر کی ابتدائی طنز میں ان مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ فکر تونسوی دہلی کے چوراہے پر بیٹھتا ہے تو روز اسے نئی کہانیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کبھی وہ شرنارتھیوں کے جلوس، کبھی مزدوروں، بھنگیوں، عورتوں اور معزز آدمیوں کے جلوس دیکھتا ہے جو کبھی راشن کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں اور کبھی قرضہ حاصل کرنے کے لیے اضطراب کی کیفیت میں نظر آتے ہیں۔ شرنارتھی بزازوں کی حالت پہ اس وقت اسے ترس آتا ہے جب بارش کے چھینٹے پڑتے ہیں تو ان ٹاٹ بچھائے بزازوں میں بھگدڑ مچ جاتی ہے اور پھر ان کے ذہن جھلاتے ہوئے پاکستان چلے جاتے ہیں جہاں ان کی اپنی دکانیں تھیں اور جن پر اب مسلمان قبضہ کر چکے ہیں۔ فکر اس چوراہے میں جنم لینے والی کہانیاں دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> اس چوراہے نے کئی کہانیوں کو جنم دیا۔ کئی کہانیوں کو دم توڑتے ہوئے دیکھا لیکن یہ چوراہا ابھی تک قائم ہے۔ یہ سنگدل ابھی تک یہ کہانیاں سن اور دیکھ رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر میں چوراہا ہوتا تو میرا دماغ تو واقعی پاش پاش ہو جاتا۔ میرا سینہ پھٹ جاتا۔[۱۰]

ہجرت کرنے والے شرنارتھی غم غلط کرنے کے لیے شراب خانہ کا رخ کرتے ہیں۔ مزدور، ڈرائیور، کلرک

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

اور شر نارتھی شراب کے نشہ میں ایک دوسرے کو گالیاں بکتے ہیں۔ لیکن شر نارتھی تو گالی بھی نہیں دے سکتا۔ ”وہ شراب خانے میں“لکھتے ہیں:

> لیکن شر نارتھی گالی بھی تو نہیں دے سکتا۔ وہ خاموش ہے گم سم جیسے وہ خود ایک خاموش گالی...اس طویل خاموشی کے دوران میں کبھی کبھی ایک آدھ فقرہ گڑبڑا اٹھتا ہے۔ لے کے رہیں گے پاکستان! لیکن اس بڑبڑاہٹ پر شراب خانے میں کوئی سرزنش نہیں ہوئی۔ یہ دھماکا ہوئے ایک سال گزر چکا ہے اور لوگ بھول گئے ہیں کہ ڈکشنری میں ایک نئے لفظ ”شر نارتھی“ کا اضافہ ہوا ہے۔ (۱۱)

فکر پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم کے ہرگز حق میں نہیں تھے۔ وہ ایسی آزادی کے خلاف ہیں۔ جس میں انسانی رشتوں کے تقدس کو پامال کر کے آزادی حاصل کی جائے۔ فکر کا خیال ہے ہندوستان اور پاکستان کے لوگ ایک دوسرے سے نفرت نہیں کرتے تھے نہ وہ تقسیم ہونا چاہتے تھے۔ وہ تو صرف انگریز سے آزادی کے خواہاں تھے مگر سیاسی مقاصد کے لیے دونوں طرف کے آئینی آقاؤں نے ان کے درمیان نفرت کی دیوار کھینچ دی۔ فکر متحدہ ہندوستان کے ناسٹلجیا سے کبھی نہیں نکل سکے۔ وہ تونسہ اور لاہور کے ہجر میں گھلتے رہے۔ ”واہگہ کی نہر“ میں فکر دکھاتے ہیں کہ جب دونوں ملکوں کی حکومتوں نے ”واہگہ کی نہر“ پر دونوں طرف کی عوام کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع فراہم کیا تو لوگوں کا سمندر واہگہ کی نہر پر جمع ہو گیا۔ اگر لوگ ایک دوسرے سے نفرت کرتے تو وہ واہگہ کی نہر پر اس چاہت سے کیوں آتے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> یہ سمندر انہی آدمیوں کا تھا جو ایک سال پہلے ایک دوسرے کے بدترین دشمن تھے اور جو اب درختوں کے سائے میں بیٹھے گپیں اڑا رہے تھے۔ خربوزے اڑا رہے تھے۔ کلکاریاں مار رہے تھے۔ ایک مسلمان عورت ایک دھوتی پوش جنٹلمین کے لیے لاہور سے قیمے والی روٹیاں پکا کر لائی تھی اور ہنس ہنس کر اسے کھلا رہی تھی۔ ہزارہا آدمی واہگے کی سرحد کو لاکھٹکے اور بغیر روک ٹوک کے عبور کر کے ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ (۱۲)

لیکن وصال کے یہ دن، یہ کلکاریاں بغیر روک ٹوک کے سرحد کے ادھر اُدھر جانا، فکر اور ساحر، احمد ندیم قاسمی، احمد راہی، عبدالمتین، عارف، ابن انشا، چوھدری برکت علی، صلاح الدین اکبر کا ایک دوسرے کو دوڑ کر گلے

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

ملنا دونوں حکومتوں کو پسند نہ آیا۔ جب فکر تیسری مرتبہ واہگہ کی نہر پر اپنے بچھڑے دوستوں سے ملنے آیا تو واہگہ کی نہر سنسان تھی۔

> اب وہاں نہ خربوزوں کا وجود تھا، نہ آموں کا، نہ قیمے کی روٹیوں کا۔ ایک سنسانی اور ویرانی سی سرحد پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ قہقہے، وہ گونجاریں، وہ آنسو، وہ آنسو وہ داستانیں سب کچھ اپنے اپنے گھر کو لوٹ گیا تھا۔ (۱۳)

مشہور نقاد احتشام حسین فکر کے متعلق لکھتے ہیں:

> ہندوستان کی تقسیم اور اس کے بعد کے واقعات نے بہت سے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ خاص کر وہ لوگ جو براہ راست اس کی زد میں آئے۔ جذباتی حیثیت سے یا تو بے حس ہو گئے یا زندگی کے بہت سے بھید ان پر کھل گئے۔ فکر بھی ان لوگوں میں سے ہیں۔ (۱۴)

فکر کے طنز کے موضوعات بے شمار ہیں۔ اس نے سیکڑوں طنزیہ مضامین قلم بند کیے۔ اس کے طنز و مزاح کے محبوب موضوعات میں عدم مساوات، جعلی الاٹ منٹس، چور بازاری، لوٹ کھسوٹ، رشوت، سفارش، معاشی اور معاشرتی ناآسودگیاں، طبقاتی اونچ نیچ، بیروز گاری اور جمہوریت اس کا خاص موضوع ہے۔ اپنے عہد کی منافقت، مزدور کسانوں اور عام طبقے کا استحصال، ہندوستانی معاشرے کی اخلاقی پستی، کج روی، تنگ نظری، رشوت ستانی، جعل سازی، بے ایمان، دروغ گوئی، ایمان فروشی، سرکاری دفاتر میں مافیا کا قبضہ، سیاسی لیڈروں کا دوغلا پن، ذاتی محرومیوں اور معاشرتی محرومیوں سے پیدا ہونے والا خلا بھی اس کی طنز کا نشانہ بنتا ہے۔ فکر ترقی پسند، اشتراکی سوشلسٹ نظریات کے ادیب تھے۔ لہٰذا یہ نظریات اس کی طنز کو مہمیز کا کام دیتے ہیں۔ انھی نظریات کی وجہ سے فکر کی طنز میں بھوک، افلاس، مذہب اور خدا سے بغاوت کی بو آتی ہے۔ فکر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان برادرانہ تعلقات کے قائل ہیں۔ وہ ان ملکوں کے درمیان نفرت کی دیواریں گرا دینا چاہتے ہیں۔ فکر ہندوستان اور پاکستان سے یکساں محبت کرتے ہیں۔ اگر تنقید کرتے ہیں تو دونوں ملکوں کے مشترکہ مسائل کو بنیا بنا کر دونوں ملکوں کو اکٹھے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ بیوی کی آڑ میں فکر نے ہندوستانی عورت کی خوبیوں اور خامیوں کو بیان کیا ہے۔ اپنے آپ پر طنز کرنا بڑا دشوار مرحلہ ہوتا ہے مگر فکر نے اپنی بیوی کے ساتھ ساتھ خود کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ جب وہ اپنے آپ کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں تو غالب کی طنز کی جھلک نظر آتی ہے۔

فکر کی ابتدائی دور کی تصانیف اور تخلیقات کو دیکھ کر نقادوں نے فکر کو طنز نگار (satirist) کہا جبکہ ایسا نہیں

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

ہے۔ فکر طنز نگار بھی ہیں اور مزاح نگار بھی ہیں۔ طنز اور مزاح کو آپس کو جدا کیا بھی نہیں جاسکتا۔ ہندوستان کے ابتدائی چند سال آبادکاری کے مسائل بہت مشکل تھے اور فکر تونسوی کے ذاتی حالات بھی دگرگوں تھے۔ فکر روزگار کی تلاش میں دربدر بھٹک رہا ہے۔ انھیں کوئی منزل اور ٹھکانہ نظر نہیں آتا مگر ۱۹۵۵ء سے فکر کو دہلی کے مشہور اخبار "ملاپ" میں لکھنے کا موقع ملتا ہے تو معاشی آسودگی ملتی ہے تو فکر کی زندگی میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ اب ان کی طنز میں تلخی کی شدت کم ہوجاتی ہے اور اس کی طنز نگار میں مزاح نگاری کے چٹکلے بھی شامل ہوجاتے ہیں۔ اب وہ جہاں طنز کے تیر چلاتا ہے وہاں معاشرے کی ناہمواریوں پر انھیں ہنستا تا بھی ہے۔ ویسے بھی صحافتی کالم میں طنز کے ساتھ مزاح شامل کرنا ضروری تھا کیونکہ لوگ روزمرہ کی ناہمواریوں کو مزاح کی شیرنی کے ساتھ سہہ سکتے تھے۔

فکر کی طنز و مزاح میں موضوعات کا تنوع ہے۔ فکر نے معاشرتی مسائل، غربت، حکومتی رویے، عام آدمی کے مسائل، بے ہنگم آبادی، روزمرہ کے واقعات، چوری کی بڑھتی ہوئی وارداتوں، سمگلروں، بلیک مارکیٹ کرنے والے، راتوں رات امیر ہونے کی خواہش کرنے والے، ادیبوں کی معاشی حالت، فیملی پلاننگ، رشوت جیسے موضوعات پر طنزیہ تحریریں لکھیں۔

فکر "اور سائیں بابا نے کہا" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

> ملک میں زبردست قحط پڑ گیا تو چھوٹے آدمی نے صدق دل سے دعا مانگی بھگوان بارش بھیج دے تاکہ ہم موت سے بچ جائیں۔ بھگوان نے دعا قبول کی اور موسلا دھار بارش بھیج دی اور بارش میں چھوٹے آدمی کا مکان گر گیا اور چھوٹا آدمی اس کے نیچے دب کر مر گیا۔(۱۵)

فکر کا تعلق عام آدمی سے تھا۔ وہ پسے ہوئے طبقے کے درمیان زندگی گزارتا رہا۔ جن مشکلات کا سامنا چھوٹے آدمی کو تھا فکر بھی انھیں مسائل سے دوچار تھا۔ فکر کا مشاہدہ گہرا تھا۔ وہ روزمرہ پیش آنے والے مشاہدات کو اپنے مضامین یا کالم کا موضوع بناتا تھا۔ ذرائع آمدورفت بھی کسی ملک کے معیار زندگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ فکر تونسوی نے دہلی میں چلنے والی منی بسوں کو اپنی طنزیہ تحریروں میں جگہ دی اور اس میں سوار ہونے، اترنے اور سفر کرنے کے دوران جو صورتحال پیش آتی ہے۔ فکر نے اس کا تجزیہ بڑے مزے اور مضحکہ خیز انداز میں کیا۔ فکر نے منی بس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

> دہلی میں منی بسیں چلتی ہیں تو یوں لگتا ہے منی سکرٹ پہنے فلم "یوئی" کی ہیروئن چھوکری جارہی ہے اور تکمیل شوق کی دعوت دیتے ہوئے کہہ رہی ہے آؤ آؤ میں اپنے ساتھ لے چلوں۔

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

نظام الدین، بھوگل لاجپت نگر اور جب آپ اپنی تمناؤں کی رال ٹپکاتے ہوئے اس منی سکرٹ کا دلہن پکڑ لیتے ہیں اور بس میں داخل ہو جاتے تو آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خود داخل نہیں ہوئے بلکہ کسی نے آپ کو بالوں سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔ آپ چلا اٹھے ہیں۔ روکو بس! میرا دم گھٹ رہا ہے مجھے باہر نکلنے دو۔(۱۶)

مضحک کردار بھی مزاح تخلیق کرنے کا بہترین حربہ ہیں۔ مضحک کردار ایک فرد کا نہیں پورے معاشرے کا عکس ہوتے ہیں۔ یہ کردار جہاں انسانی زندگیوں کا اندرونی مشاہدہ کرتے ہیں وہاں اخلاقی، مذہبی، معاشرتی، سیاسی زوال کی نشاندہی کرتے ہیں۔ فکر نے بھی دیگر مزاح نگاروں کی طرح کئی مضحک کردار تخلیق کیے ہیں۔ جو مزاح بھی پیدا کرتے ہیں اور اپنی مضحک حرکتوں سے معاشرے کی کج رویوں کو بیان کرتے ہیں۔ فکر نے پروفیسر بدھو، ماڈرن اللہ دین، چوپٹ راجا کے علاوہ دیگر کئی کردار تخلیق کیے۔ ”رادھو جانی“ کے عنوان سے لکھتے ہیں:

اپنے والد صاحب سے خاصے مختلف ہیں۔ والد صاحب طوائفوں کے رسیا تھے۔ جوا خانے میں جانا ان کی کمزوری تھی۔ جس دن جوا ہار کر آتے، شراب ضرور پیتے تھے۔ اون کے دھاگے بیچنے کا کاروبار کرتے تھے۔ خاصی خوشحال زندگی گزاری۔ مگر رادھو جانی اتنے شریف الطبع ہیں کہ حسین سے حسین تر عورت ان کے پلو سے گزر جائے لیکن انھیں علم نہیں ہوتا اپنی بیوی کے سوائے دنیا کی کسی عورت کو حور نہیں سمجھتے۔ چنانچہ حور کی برکت سے چھ بچے پیدا کیے۔ تین فیملی پلاننگ سے پہلے تین بعد۔(۱۷)

فکر سمگلروں، ذخیرہ اندوزوں اور ناجائز ذرائع سے دولت کمانے کے سخت خلاف ہیں۔ ان کا خیال ہے ہندوستان میں زیادہ تر لوگ ان ذرائع سے آمدنی حاصل کر کے ترقی کرتے ہیں اور پھر ملک کے اعلیٰ عہدوں سے ہوتے ہوئے پردھان منتری بن جاتے ہیں اور عوام کی خدمت کے نام پر غریبوں سے ووٹ حاصل کرتے ہیں۔ فکر تونسوی نے ایسے کئی کردار تخلیق کیے جو گنڈیریاں بیچتے بیچتے ٹائر کی سمگلنگ کرتے ہوئے ملک کے اعلیٰ سیاسی عہدوں تک پہنچے۔ اڑن تختی مہاراج کے بارے لکھتے ہیں:

اڑن تختی مہاراج کی سولہ کشتیاں، سترہ جیپیں، اٹھارہ کوٹھیاں اور انیس بیویاں موجود ہیں۔ مہاراج نے ایک فلم کمپنی میں لائٹیں پھینکنے والے ایک چھوکرے کی حیثیت سے اپنی زندگی سٹارٹ کی۔ فلمی ہیروئن اور پروڈیوسروں کو غیر ملکی ناجائز وہسکی کے جام لنڈھاتے دیکھ کر

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

> انھیں بھی ترقی کرنے کا آئیڈیا سوجھا اور پھر وھسکی سے جواہرات تک ہر وہ چیز اسمگل کرنے لگے جو عیاش رئیسوں کی مانگ تھے اور جن کے خلاف فلموں میں آواز اٹھائی جاتی تھی۔(۱۸)

ہندوستانی سیاست، جمہوریت، ووٹر فکر کی مزاح نگاری کا اہم موضوع ہے۔ چوپٹ راجا ایک سیاسی طنز ہے جو کتابی شکل میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ فکر نے "موزوئے تنگ" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اشتراکی اور انقلابی نظریات کا پرچار کیا گیا ہے۔ فکر نے خود بھی عملی سیاست میں حصہ لیا۔ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر رہے اور الیکشن بھی لڑا۔ لہٰذا فکر ہندوستان کی سیاست کے ہر پیچ کو سمجھتے تھے۔ اس لیے اپنے کئی مضامین جن میں "اسمبلیوں کی بھاشا"، "ڈینگ ڈینگ اسمبلی"، "راج نگر کی کہانی"، "جمہوریت بیگم سے ملاقات"، "الیکشن"، "ووٹر"، "ہندوستان کے سیاست دان"، "فکر تونسوی نے الیکشن لڑا" جیسے مضامین میں سیاست کی مکاریوں کا پردہ چاک کیا ہے۔

چوپٹ راجا کا ہیرو چوپٹ ناتھ جس کو شہنشاہیت وراثت میں ملی ہے۔ جب عوام نے بغاوت کی اور جمہوریت کی بات چل نکلی تو آٹوکریٹ راجا ڈیموکریٹ بن جاتا ہے۔ اس نے تاج شاہی اتار کر تاج جمہوریت پہن لیا۔ نظام جمہوری ہو گیا مگر تاج قائم رہا۔ جمہوری تخت پر بیٹھ کر اُسے محسوس ہوا کہ جمہوریت تو شاہیت سے بھی اعلیٰ چیز ہے۔ جب راجا اس جہان فانی سے جانے لگے تو اس نے اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

> بیٹا جمہوریت کی جو مشعل میں نے جلائی تھی۔ اس کی روشنی میں اپنا چہرہ دیکھتے رہنا میرے بعد میری گدی کا دعویٰ نہ کرنا۔ یہ گدی عوام کی ہے اور پھر اس مشعل کو جلانے والا اس جہاں فانی سے چل بسا۔ عوام نے دھاڑیں مار مار کر کہا اس روشنی کے بجھ جانے سے ہماری دنیا اندھیر ہو گئی ہے اور پھر انہی عوام نے بھی راجا چوپٹ ناتھ کی جھونپڑی کے باہر اکٹھے ہو کر کہا جمہوریت کی مشعل چوپٹ ناتھ کے بیٹے کے ہاتھ میں دے دو وہی اس کا واحد مستحق ہے۔(۱۹)

فکر اس بات سے نالاں ہیں کہ سیاسی لوگ جمہوریت، جمہوریت کے راگ آلاپ کر کس طرح اپنا وراثتی نظام مستحکم کرتے ہیں۔ عوام بے چاری کو جمہوریت میں سوائے نعرے لگانے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ فکر کے سیاسی خیالات اور سیاسی جماعتوں کے رویے عوام کے ساتھ آج بھی وہی ہیں۔ شاید ہندوستان میں قدرے حالات بہتر ہو گئے ہیں مگر پاکستان کی سیاست کی جیتی جاگتی تصویر چوپٹ راجا میں نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے مصنف نے

موجودہ دور کے جمہوری دور حکومت کا بغور مشاہدہ کر کے یہ سیاسی طنز لکھی ہے۔ کنہیالال کپور اس کتاب کے بارے لکھتے ہیں:

چوپٹ راجا، ایک مسلسل سیاسی طنز ہے۔ جس میں نہایت تیکھے انداز میں بر سر اقتدار طبقے کی قلعی کھولی گئی ہے اور اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ اگر اس کا خمیر ریاکاری سے اٹھایا گیا نہ ہوتا تو ہندوستان جنت نشاں کی حالت اتنی قابل رحم نہ ہوتی۔(۲۰)

فکر تونسوی ہندوستان میں رائج جمہوریت کے سخت ناقد تھے۔ اس نے اپنے مضمون ”چاند اور گدھا“ میں اسمبلیوں کے ممبران اور شعرا کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ آج کل گدھے بھی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو جائے اور گدھوں نے شاعری کا شغل اختیار کر لیا ہے۔ جب چاندنی رات میں مصنف نے جھاڑیوں میں چھپے گدھے سے مخاطب ہو کر کہا مجھے فکر تونسوی کہتے ہیں، شاعر ہوں، آپ اپنا تعارف کروائیے۔ تو گدھا فوراً بولا میں اسمبلی کا ممبر ہوں۔ فکر کو اس بات پر کوئی تعجب نہیں ہوا کیونکہ جمہوریت میں ایسے حادثے عام ہو جاتے ہیں۔ لیکن فکر کے لیے پریشان کن بات یہ تھی کہ گدھے کو شاعری کا روگ لگ گیا ہے۔ گدھے کو شاعری کا شوق تو ہے مگر شاعری کے جو لوازمات ہوتے، وہ گدھے میں بدرجہ اتم نہیں ہیں۔ اگرچہ اُسے دو بیویوں کی بے وفائی کا غم ہے۔ اس کا بیٹا بمبئی میں ریس میں شرکت کرنے کے لیے گیا ہوا ہے۔ اس کی ہار کا غم ہے۔ مگر اس کو کوئی ایسا ابدی غم نہیں جس سے وہ ڈھنگ کا مصرع تخلیق کر سکے۔ چنانچہ فکر تونسوی لکھتے ہیں:

حیرت ہے کہ جذبات موجود تھے، غم موجود تھا، سونا تھا، سمگلنگ تھی، بد دیانتی تھی، چاولوں کے اسٹاک تھے، رشوت تھی، رشوت کا مقدمہ تھا اور دو بیویاں موجود تھیں۔ ان کی بے وفائی سامنے تھی۔ لڑکے کی محبت، اس کی ریس، اس کی ہار، اس کا انجام۔ اس کے باوجود شعر وجود میں نہیں آ رہا تھا۔ لوگ بغیر جذبہ و غم کے بادشاہوں کے قصیدے تک لکھ ڈالتے ہیں۔ لیکن اس گدھے کی طبیعت میں اپنی غمگین روح کی تسکین کے لیے ایک شعر تک جنم نہیں لے رہا تھا۔ شاعری کو اتنے ظالم روپ میں مَیں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔(۲۱)

تحریف نگاری یا پیروڈی طنز و مزاح پیدا کرنے کا ایک حربہ ہے۔ یہ مزاح نگار کا ہتھیار ہے۔ جو لفظوں کی معمولی تبدیلی سے کہیں قاری کو ہنساتا کہیں تنقید کر کے معاشرتی بے اعتدالیوں کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ اُردو شعر و نثر میں تحریف نگاری یا پیروڈی کا بہت چلن ہے۔ اُردو کے تمام مزاح نگاروں نے اس حربے سے فائدہ اٹھاتے

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

ہوئے قاری کے لیے مزاح کا سامان پیدا کیا ہے۔ اردو مزاح نگاری میں پیروڈی کے عمدہ نمونے موجود ہیں۔ فکر تونسوی نے بھی تحریف نگاری کو کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ اس کا ایک مضمون جو ''ساتواں شاستر'' میں شامل ہے۔ ''آسمانی کتاب'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون میں آسمانی کتابیں ''اناجیل مقدس'' کے اسلوب و فکر کی تحریف کرتے ہوئے فکر نے فسادات ۱۹۴۷ء کا درد بیان کیا ہے۔ فکر نے اس تحریف میں خدا، مذہب، تقدیر پر ایمان رکھنے والے، قوم اور ملک کے نام پر ستی جذباتیت کا شکار ہونے والے مذہبی جنونیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس لیے فکر نے اسلوب، ڈکشن اور فکر انجیل مقدس کا اپنایا ہے۔ چنانچہ خداوند خدا کا حکم مان کر خداوند کے بیٹوں نے خنجر نکالے اور ایک دوسرے کو گھونپنے لگے۔ خداوند خدا خوش ہو کر یہ تماشا دیکھتا رہا۔ اس کے بیٹے غلام سے آزاد بنے اور آزاد سے شیطان بنے۔

> خداوند خدا کے بیٹوں نے کہا تم ہندو والے دیش میں چلے جاؤ۔ تم مسلمان والے ملک میں چلے جاؤ۔ تمھارا بھیڑیں بننا ہی مناسب و موافق ہے۔ ہم تمھیں ہانکیں گے۔ سو بھیڑوں کا نام شرنارتھی ہوا۔ شرنارتھی کی چشم میں آگ بھڑکی ہوئی تھی تو مہاجر کی چشم بھی شعلہ تھی۔ پھر انھوں نے خدا کے بیٹوں کا حکم مانا اور اپنے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور پناہ گزین کہلائے۔[۲۲]

وہ بحالی کے بیان میں لکھتے ہیں:

> اور رفیوجیوں نے جو یہ کہا اور اب پھر کہتے ہیں کہ وہ رسوا بسیار اور ذلیل بار بار ہوئے اور اپنا وطن ترک کیا اور بچے مروائے اور زوجاتیں گم کرائیں اور اپنی الفت کہ پیدائش سے پہلے قائم رکھتے تھے، نثار کی۔ صلہ اس کا ملنے میں ہنوز نہیں آیا۔ سو گستاخی کرتے تھے کہ خداوند خدا کے بیٹے سزا اس گستاخی کی دینے کا وقوف کامل رکھتے ہیں۔ ایسا قانون میں کہا ہے۔ خداوند خدا کی اپنی خاص کتاب میں اور رفیوجیوں کی یہ آسمانی کتاب جو اتری ہے اسے مورد جرم کا ٹھہراتے ہیں اور تشدد کی راہ گردانتے ہیں۔ سنو رفیوجیوں پر لازم ہے کہ ایسا ہی تسلیم کریں۔ خداوند انھیں بے پایاں رحمت میں غرق کر دے گا۔[۲۳]

''آسمانی کتاب'' میں فکر نے مذاہب کے ماننے والوں کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے کہ تمام مذاہب تو امن اور انسانوں سے محبت کا درس دیتے ہیں مگر ہندوستان میں انگریزوں کا مذہب عیسائی ہے۔ مسلمان اسلام کو اپنا مذہب

تسلیم کرتے ہیں اور ہندو بھی قدیم مذاہب کو ماننے والے ہیں مگر ۱۹۴۷ء کے فسادات میں کسی قوم نے مذہبی تعلیمات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور لاکھوں انسانوں کی اس طرح تقسیم کی گئی جیسے بھیڑ بکریاں بانٹی جاتی ہیں۔ فکر Humanist تھے انسانیت کی تذلیل، قتل و غارت ان سے برداشت نہ ہوئی۔ چنانچہ اس ساری قتل و غارت کا ملبہ خداوند اور اس کے فرزندوں پر ڈال دیا کہ یہ سب کیا دھرا ان کا ہے۔ انگریز، مسلمان، ہندو تو بے بس ہیں کیونکہ خدا نے ایسا چاہا۔ ان لوگوں (عیسائی، ہندو اور مسلمانوں) نے تو خدا کے کُن کو عملی جامہ پہنچایا۔

مرزا غالب لافانی فن کار تھا۔ مرزا غالب کو فطرت نے جو لافانی اسلوب شاعری اور نثر میں عطا کیا تھا۔ اس کی بدولت غالب ہر زمانے میں زندہ و جاوید ہے۔ شعرا و ادبا نے ہمیشہ غالب کے اسلوب کو رشک سے دیکھا ہے۔ غالب کی شاعری، خطوط اور اسلوب کو مزاح نگاروں نے خاص طور پر تحریف نگاری میں استعمال کیا اور مقبولیت حاصل کی ہے۔ انور سدید نے ”غالب کے نئے خطوط“ میں خطوط غالب کی پیروڈی کرتے ہوئے اپنے ہم عصر شعرا کا مضحکہ اڑایا ہے۔ ہاشم عظیم آبادی نے ”عالم بالا سے غالب کے خطوط ہاشم آبادی کے نام“ میں خطوط غالب کی منظوم پیروڈی کی ہے۔ فکر تونسوی کے ہم عصر اور دوست کنہیا لال کپور نے ”غالب جدید شعرا کی محفل میں“، ”ترقی پسند غالب“، ”غالب کے اُڑیں گے پرزے“ سے مزاح نگاری میں شہرت حاصل کی ہے۔

فکر تونسوی نے ویسے تو غالب کے کئی اشعار کی تحریف اور تشریح مزاحیہ انداز میں پیش کی ہے۔ جیسے غالب کے مشہور شعر:

میں نے کہا بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

فکر ”غالب کا ایک شعر“ میں لکھتے ہیں:

> یہ شعر سن کر ذہن میں ایک ڈرامائی سین ابھرتا ہے جو یوں ہے کہ محبوبہ کے گھر میں کوئی فنکشن ہے شاید محبوبہ اپنا برتھ ڈے منا رہی ہے۔ چونکہ اس فنکشن میں محبوبہ مرکزی کردار رکھتی ہے اس لیے اس فنکشن کے اجتماع کو بزم ناز کہا گیا ہے۔[۲۴]

مرزا غالب بھی بن بلائے اس فنکشن میں موجود ہیں اور غالب کا رقیب جس نے غالب سے قیمتی لباس پہن رکھا ہے بھی موجود ہے۔ غالب سے رقیب کی محفل میں موجودگی برداشت نہ ہوئی تو اس نے محبوبہ سے رقیب کو نکالنے کی فرمائش کی۔ محبوبہ کی رگ شرارت پھڑکی اور اس نے جھٹ غالب کو کان سے

پکڑ کر اٹھا دیا اور گیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "گیٹ آؤٹ۔" فکرؔ نے "غالب بنام فکر" میں غالب کے خطوط کی تحریف کی ہے۔ ایک خط میں غالب اس سے یوں مخاطب ہے:

> سہ شنبہ ۱۵ دسمبر
>
> فکر جہاں ہم سوچتے تھے کہ تم نے ذہن رسا پایا ہے لیکن تم تو ایک ہونق نکلے۔ عزیز سمجھ کر۔ تمھیں خبر کیا تھا کہ ہم دہلی آرہے ہیں۔ تم لے اڑے اور اب جو دیکھتا ہوں ڈاک میں اخبار سے دو تراشے چلے آرہے ہیں کہ مرزا نوشہ بہ نفس نفیس اپنی صد سالہ برسی کی نگرانی کی خاطر تشریف لا چکے ہیں۔[۲۵]

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> میاں فکر سنو، بھانڈ مت بنو، ہمارا ٹھکانہ دہلی میں صرف تمھیں معلوم ہے یا ایک سیٹھ بُلاقی رام کو کہ جس سے ہماری صاحب سلامت تھی۔ فاقہ مستی میں اس کے سہارے پاؤ بھر گوشت اور شوربہ گوشت کی ایک پلیٹ چلتی تھی۔ لہٰذا تیسرے کو ہمارے قیام کی خبر کیوں دو۔ چند دن کے لیے تماشائے اہلِ کرم دیکھنے دو۔ تمھاری صحت اور عقل دونوں کے لیے دعا کا طالب،
>
> غالب۔[۲۶]

حواشی

۱۔ فکر تونسوی، "میں"، (نئی دہلی: اہلیہ والیہ بک ڈپو، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۰۵

۲۔ ایضاً، ص ۲۸

۳۔ ہاشم شیر خان، "ڈیرہ غازیخان کے تہذیبی خدوخال"، (ملتان: بک اوشن پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء)، ص ۱۴۷

۴۔ فکر تونسوی بنام اللہ نواز خان کھتران، مملوکہ سردار سعد اللہ خان کھتران

۵۔ ممتاز مفتی، "ہندیاترا"، (لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۲۰۱۶ء)، ص ۲۴۹ تا ۲۵۰

۶۔ فکر تونسوی، "چھٹا دریا"، (لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۴۸ء)، ص ۲۴

۷۔ رؤف پاریکھ، "اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی و سماجی پس منظر"، (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۲ء)، ص ۲۹

۸۔ ڈاکٹر انور سدید، "اردو نثر کے چند مزاح نگار"، (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۵۵

۹۔ فکر تونسوی، "ساتواں شاستر"، (دہلی: مکتبہ شاہراہ، ۱۹۵۰ء)، ص ۱۷

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۹
۱۱۔ ایضاً، ص ۳۸ تا ۳۹
۱۲۔ ایضاً، ص ۶۱
۱۳۔ ایضاً، ص ۶۵
۱۴۔ ایضاً، ص ۱۰
۱۵۔ ایضاً، ”اور سائیں بابا نے کہا“، مشمولہ ماہ نامہ ”بیسویں صدی“، دہلی، مارچ ۱۹۵۹ء
۱۶۔ فکر تونسوی، ”پیاز کے چھلکے“، (نئی دہلی: ایلو والیہ بکڈپو، نیو روہتک روڈ، ۱۹۷۷ء)، ص ۷
۱۷۔ ایضاً، ”آخری کتاب“، (نئی دہلی: ایلو والیہ بک ڈپو ۱۹۷۷ء)، ص ۱۴ تا ۱۵
۱۸۔ ایضاً، ”چھلکے ہی چھلکے“، (نئی دہلی: ایلو والیہ بک ڈپو، ۱۹۷۷ء)، ص ۱۲۰
۱۹۔ ایضاً، ”چوپٹ راجا“، (دہلی: لاجپت رائے اینڈ سنز، اردو بازار، ۱۹۷۳ء)، ص ۱۵۲
۲۰۔ ایضاً، ص: ۴
۲۱۔ ایضاً، ”چاند اور گدھا“، (لاہور: آئینۂ ادب، انار کلی، ۱۹۶۱ء)، ص ۲۶
۲۲۔ ایضاً، ”ساتواں شاستر“، ص ۱۷
۲۳۔ ایضاً، ص ۸۵ تا ۸۶
۲۴۔ ایضاً، ”پیاز کے چھلکے“، ص ۲۶۷
۲۵۔ ایضاً، ”چھلکے ہی چھلکے“، ص ۲۶۷
۲۶۔ ایضاً، ص ۲۶۸

مآخِذ

۱۔ پاریکھ، رؤف، ”اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی و سماجی پس منظر“، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۲ء
۲۔ تونسوی، فکر، ”میں“، نئی دہلی: ایلو والیہ والیہ بک ڈپو، ۱۹۸۷ء
۳۔ ____، ”چھٹا دریا“، لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۴۸ء
۴۔ ____، ”ساتواں شاستر“، دہلی: مکتبہ شاہراہ، ۱۹۵۰ء
۵۔ ____، ”پیاز کے چھلکے“، نئی دہلی: ایلو والیہ بک ڈپو، ۱۹۷۷ء
۶۔ ____، ”آخری کتاب“، ____، ____
۷۔ ____، ”چھلکے ہی چھلکے“، ____، ____
۸۔ ____، ”چوپٹ راجا“، دہلی: لاجپت رائے اینڈ سنز، اردو بازار، ۱۹۷۳ء
۹۔ ____، ”چاند اور گدھا“، لاہور: آئینۂ ادب، انار کلی، ۱۹۶۱ء
۱۰۔ خان، ہاشم شیر، ”ڈیرہ غازی خان کے تہذیبی خدوخال“، ملتان: بک اوشن پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

۱۱۔ سدید، انور، ڈاکٹر، ”اردو نثر کے چند مزاح نگار“، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۱۲۔ مفتی، ممتاز، ”ہندیاترا“، لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۲۰۱۶ء

رسائل وجرائد

۱۔ ماہ نامہ ”بیسویں صدی“، دہلی، مارچ ۱۹۵۹ء

غیر مطبوعہ خطوط

۱۔ فکر تونسوی بنام اللہ نواز خان کتھران، مملوکہ سردار سعد اللہ خان کتھران